دھواں دھواں چراغِ جاں

{ شعری مجموعہ }

علی الدین نوید

مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد

○ طبع — اوّل
○ سنہ اشاعت — ڈسمبر ۱۹۹۳ء
○ کتابت — الفلاح کمپیوٹر مادنّا پیٹ حیدرآباد فون 521098
○ طباعت — اسپیڈ پرنٹرس، فرح کالونی سعید آباد حیدرآباد
○ ناشر — مکتبۂ شعر و حکمت 6-3-659/2 کپاڈیہ لین سوماجی گوڑہ حیدرآباد 500004
○ سرِورق — طالب خوندمیری
○ تزئین — جمشید نویدؔ سیما اِمروز، شہلا افروز، صبا فردوس، نغمہ شہروز، توصیف نوید، تمجید نوید، توحید نویدؔ
○ قیمت — ساٹھ روپے Rs. 60 = 00

کتاب ملنے کے پتے:

1 مکتبۂ شعر و حکمت 6-3-6509/2 کپاڈیہ لین سوماجی گوڑہ حیدرآباد 500004
2 حُسامی بک ڈپو، چارمینار حیدرآباد۔
3 سیل کاؤنٹر روزنامہ سیاست جواہرلال نہرو روڈ حیدرآباد۔
4 الکتاب پبلشرز گن فاؤنڈری حیدرآباد۔
5 حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) 6-3-6509/2 سوماجی گوڑہ حیدرآباد۔
6 مکتبۂ جامعہ لیمیٹیڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی، بمبئی۔
7 شب خون کتاب گھر 313 رانی منڈی الہ آباد۔۳
8 اسٹوڈنٹس بک ہاؤز چارمینار حیدرآباد۔
9 مصنف 16-3-410 چنچل گوڑہ حیدرآباد 500024 اے پی۔
فون 2441443

یہ کتاب اُردو اکیڈمی آندھراپردیش کی جُزوی مالی اِعانت سے شائع کی گئی

اِنتسابؔ

ہونہار کمسن لختِ جگر

"تنویر نوید" مرحُوم کے نام،

جس کی حادثاتی موت نے، زمین سے آسمان کی طرف

میری آنکھیں پھیر دیں

ایک پَل میں خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے

کھو گیا ہنستا ہوا بچپنؔ، کِھلونے رہ گئے

فہرست

بسم اللہ تعالیٰ

آئینہ پسِ آئینہ

شاعری جدید ہو یا قدیم اپنے عہد کی غمّاز ہوتی ہے ۔ ہر عہد اپنے ساتھ اپنا مخصوص ڈِکشن ، اور پیرایۂ اِظہار لاتا ہے ۔ ان شعری آوازوں میں سے کئی آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے چونکا دینے والے اِظہار کے سہارے دو چار قدم چل کر دم توڑ دیتی ہیں ۔ اور صرف وہی آوازیں تخلیقی طور پر زندہ رہتی ہیں جو اپنے اندر عصری آگہی اور نئی حِسیّت کو جذب کر کے اِظہار و اسلوب کے سانچے میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ اِن میں اپنے عہد کے خدوخال جھلکنے لگتے ہیں ۔ اور یہ آوازیں اپنے عہد کی دھڑکن بن جاتی ہیں ۔

نئی شاعری کی بیل اگر صرف علائم اور ابہام کے کھُردرے اور سپاٹ اِظہار کے سہارے منڈوے چڑھنے والی ہوتی تو کتنے ہی ایسے شاعر جنہوں نے اِس طرز کو اپنایا تھا آج تخلیقی طور پر زندہ رہتے ۔ لیکن آج ہمیں نہ کہیں "کاف کی کرسی پر کالی چاندنی لیٹی ہوئی نظر آتی ہے" ۔ اور نہ کہیں "مرغ کی چونچ میں سورج" ۔ لفظوں کی شعبدہ بازی نے دم توڑ دیا ہے ۔ آج وہی شاعر و ادیب زندہ ہیں جن کے ہاں آج کے عہد کا سچّا تخلیقی حُسن جاری و ساری ہے ۔

"دُھواں دُھواں چراغِ جاں" (دوسرا شعری مجموعہ) میری زندگی کے پچھلے چودہ زینوں (۱۹۷۹ء ـ ۱۹۹۳ء) پر چڑھتے اُترتے موسموں کی دھوپ چھاؤں کا تخلیقی لبادہ ہے ۔ وہ دھواں جسے میؔر نے ہر صبح سینۂ فلک سے اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا میرے عہد کے جلتے بُجھتے چراغوں کا مقدّر بن گیا ہے ۔ تابکاری زہر میں ہر سانس ، ہر پیاس ۔ ہر خواب دھواں دھواں سا ہے ۔

لفظ و معنیٰ کے پھیلے ہوئے اس جنگل میں آپ کو کہیں وہ کانٹے بھی ملیں گے جنہیں میرے احساس کی آنکھ نے پلکوں سے اُٹھایا ہے ۔ اور کہیں دلِ گُداختہ کی چنگاریاں ، چشمِ گِریاں کی گُلکاریاں ، درونِ ذات کے اندھیروں ، اُجالوں کی لالہ زاریاں ، کائنات کے جلتے

بجھتے الاؤ کی شعلہ باریاں آپ کے ذہن میں جھلملائیں گی۔

اپنے پہلے شعری مجموعے "صدفِ تمام ریت ریت" (۱۹۷۹ء) میں، میں نے اپنے تخلیقی رویّے سے متعلق لکھا تھا کہ "شاعری میرے نزدیک نہ تو محض صنّاعی ہے اور نہ ہی تبلیغ، تحریک یا اِدارے کا پلیٹ فارم۔ میرے احساس کی آنکھ کسی مخصوص عینک کی تابع نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات کا کسی فن کار کے لاشعور میں جذب ہو جانا اتنا ہی فطری عمل ہے جتنا کہ کسی متحرک کیمرے کا اپنے احاطے میں آئے ہوئے ہر منظر کو اپنی گرفت میں لے لینا۔ اور۔۔۔ تخلیقی عمل۔ میری دانست میں شعور و لاشعور کے درمیان سانس لیتی ہوئی اس سوچ کا نام ہے جو کسی نا معلوم لمحے میں "زبان، طرز" آہنگ اور اسلوب میں ڈھل جاتی ہے

معاشرے کا کرب، ٹوٹتے، بکھرتے، بنتے، بگڑتے لمحوں کی رفاقت، اقدار کی زوال پذیری، ارتقاء کے نام پر تہذیب کی بربریت، ایسے کئی محرکات میرے اندر ایک جذر و مد کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو بُلبلوں کی مانند میرے لاشعور سے شعر کی صورت اُبھرآتے ہیں

صرف ذہانت کے بل بوتے پر شعر کہنا میری نگاہ میں مصنوعی عمل ہے۔ "دلِ گداختہ کو تخلیق کے لیے خمیر مانتا ہوں۔

آج جب کہ ادب کے میدان میں تحریکیں دم توڑ رہی ہیں، شعر کہنا میرے اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

میری قامت کا پیمانہ، میرے شعری مزاج کا آئینہ، میرے فکر و فن کا نگار خانہ تو اُن دیدہ وروں کی آنکھوں میں ہے۔ جن کی نگاہیں آئینہ در آئینہ جھلملاتے عکس کے علاوہ پسِ آئینہ بھی دیکھ سکتی ہیں۔

تو آئیے ۔۔۔۔

دھوئیں میں ۔۔۔ آنکھیں کھولیں ۔۔۔۔

دسمبر ۱۹۹۳ء
حیدرآباد

علی الدین نوید

غزلیں

۱۰

یہ نہیں کہتا کہ مَیں اندھوں میں تھا
آنکھ والوں نے مجھے دیکھا نہیں

دُعائیہ

مِری رگ رگ میں اپنا نور بھر دے
میں پتھّر ہوں مجھے آئینہ کر دے

نَفَس کی آگ کو جو موم کر دے
تُو میری خاک میں ایسا شرر دے

قلم جب ہاتھ میں تُو نے دیا ہے
تو کاغذ پر بھی چلنے کا ہُنر دے

حجاب ایسا بھی کیا اپنی زمیں سے
اُٹھا دے آسمانوں کے یہ پردے

اُفق کے پار جو منظر ہے، دیکھوں
نظر والے! مجھے ایسی نظر دے

میں اپنی جستجو میں کھوگیا ہوں
مجھے تُو میرے ہونے کی خبر دے

ہری ڈالی پہ اِک لمحہ تو بیٹھوں
پھر اُس کے بعد میرے پر کتر دے

مجھے سورج کی بینائی عطا کر
مجھے کِرنوں کا اندازِ سفر دے

جو تیری راہ میں چلنے نہ پاؤں
تو میری سانس[1] کا پیمانہ بھردے

میری سانسوں میں شعلے بھرگئے ہیں
خداوندا ! متاعِ چشمِ تر دے

نویدِ جانفزا پھر سے سنادے
مِرے مولا ! مدینے کا سفر دے

○○○



جس سے دیواریں لرزنے لگیں ایوانوں کی
وہ تو آواز تھی ٹوٹے ہوئے پیمانوں کی

ہوش مندوں کو ادا بھا گئی دیوانوں کی
دھجیاں شہر میں اُڑتی ہیں گریبانوں کی

اب تو ذہنوں میں بھی بارُود بِچھی رہتی ہے
جنگ باقی ہے کہاں، اب کھُلے میدانوں کی

یہ الگ بات، کہ چہرے پہ کہیں دُھول نہیں
خاک چھانی ہے بہت ہم نے بیابانوں کی

خواب، آوازیں، تمنّائیں، مہکتے سائے
گھر کے دروازے پہ اک بِھیڑ ہے مہمانوں کی

دولتِ کون ومکاں لے کے نہ دیں ہم جس کو
غم وہ جاگیر ہے ہم بے سَروسامانوں کی

میری آنکھوں میں کبھی ڈوب کے دیکھو تو سہی
اب بھی رعنائی ہے گُم گشتہ خیابانوں کی

آج اِک موج کے ہاتھوں میں ہے لرزاں وہ نوید
جس نے موڑی تھی کلائی کبھی طوفانوں کی

○○○



کریں تو کس پہ کریں اعتبار شہروں میں
بدن پہ سایہ بھی کرتا ہے وار شہروں میں

جو کوئی پاس سے گزُرے تو خون پی جائیں
یہ آدمی ہیں کہ بجلی کے تار شہروں میں

شکاریوں سے کہو ، جنگلوں سے لوٹ آئیں
درندے پھرتے ہیں اب بے شمار شہروں میں

کسی بھی عید یا تہوار گاؤں سے آنا
جو دیکھنا ہے جُنوں کی بہار شہروں میں

دُھواں ہیں منبر وناقوس کے اُجالے بھی
زمیں سے تا بہ فلک ہے غُبار شہروں میں

۱۶

ہر ایک شام نہ جانے کِدھر نِکلتے ہیں
یہ پھڑپھڑاتے پرندوں کے ڈار شہروں میں

اُتر کے گنبدِ بامِ فلک کی خلوت سے
ہماری طرح بس اِک پَل گذار شہروں میں

بدن پہ چہرہ نہ ہو بھی تو کیا قباحت ہے
اب آئینے کہاں مِلتے ہیں یار شہروں میں

ہر ایک شخص تعارُف میں اپنے گُم ہے نویدؔ
کِسی کا نام نہ لیکر پُکار شہروں میں

○○○



دِلوں کے درمیاں نفرت کی ایسی کھائی نہ تھی
ہزار عیب تھے پُرکھوں میں یہ بُرائی نہ تھی

شِکستہ ہاتھ میں پتوار جب تک آئی نہ تھی
ہماری ناؤ بھنور میں بھی ڈگمگائی نہ تھی

بدَن کو چھوڑ کے جاتا نہ میں تو کیا کرتا
سِوائے اِس کے کوئی صورتِ رہائی نہ تھی

نجات مِل نہ سکی رات کی سیاہی سے
کبھی دِیا ، کبھی گھر میں دِیا سلائی نہ تھی

مکان خالی نظر آرہا تھا مُکھیا کا
ندی کی باڑھ ابھی گاؤں تک بھی آئی نہ تھی

تمھاری یاد کا دامن نصیب ہونے تک
ہماری آنکھ کبھی کھُل کے مُسکرائی نہ تھی

مِرے مکان میں گھی کے چراغ کیا جلتے
امیرِ شہر کے گھر تک مِری رسائی نہ تھی

اِس اعتبار سے بچّے ہیں میرے خوش قسمت
مِرے نصیب میں اجداد کی کمائی نہ تھی



بدن میں دونوں کے بہتا تھا ایک ہی پانی
ندی سے پھر بھی سمندر کی آشنائی نہ تھی

متاعِ قیصر و کسریٰ تھی اُن کے قدموں میں
اُنہیں کے گھر میں بچھانے کو اِک چٹائی نہ تھی

ٹپک پڑی تھی قلم سے جو خط کے آخر میں
کچھ اور چیز تھی اے دوست! روشنائی نہ تھی

تُمھاری فکر کا چہرہ بھی کھُل گیا ہم پر
فقط کتاب کی وہ رسم رونمائی نہ تھی

○○○



جانے کیا کہہ کر گیا جھونکا ہوا کا، کان میں
پھول پتّھر بن گئے ہیں کانچ کے گلدان میں

سب کو اپنی اپنی دُھن ہے، سب کو اپنی اپنی فکر
زندگی ہے، یا کھڑے ہیں حشر کے میدان میں

تشنگی ہونٹوں کی آنکھوں میں اُتر جائے اگر
بُوند بھی دریا نظر آتی ہے ریگستان میں

دن کا رستہ تکتے تکتے آنکھ دُھندلانے لگی
اور کتنی دیر ہوگی صبح کے اعلان میں

جتنے غُنچے تھے مرے آنگن میں، تارے بن گئے
اک ذرا تازہ ہوا آئی جو روشندان میں

دل کی تابانی میں کوئی فرق تو آیا نہیں
کتنے سُورج بجھ گئے اِس قصرِ عالیشان میں

شہر کی پُرشور سڑکوں پر تو پھرتا ہوں نوید
نیم شب مرگھٹ کا سنّاٹا ہے لیکن جان میں

○○○



جس کو جی جان سے چاہا، وہ پرایا نکلا
میں جسے جسم سمجھتا رہا، سایہ نکلا

سانپ ہی سانپ نکل آئے گلی کوچوں سے
شہر میں بین بجاتا جو سپیرا نکلا

فرشِ گُل بن کے میں راہوں میں تری پھیل گیا
تُو یہ سمجھا کہ ترے پاؤں کا کانٹا نکلا

خوں بہا مانگنے جائیں بھی تو کس کے در پر
حاکمِ شہر ہی سر کاٹنے والا نکلا

ہم نے جب رات کے سینے میں اُتر کر دیکھا
کل کے ڈوبے ہوئے سُورج کا اُجالا نکلا

خود سے گھبرا کے جب آئینے کی جانب دیکھا
میرے چہرے سے کوئی دُوسرا چہرہ نِکلا

آندھیوں نے تو بہت زور لگایا لیکن
خشک پتّوں کے سِوا گھر سے مِرے کیا نِکلا

ہر نئی چوٹ تھی گُم گشتہ چراغوں کا نِشاں
ہر نئے زخم سے اِک زخم پُرانا نِکلا

مجھ کو جس درد نے جینے کا سلیقہ بخشا
رات اُس درد کا آنکھوں سے جنازہ نِکلا

آسماں اور زمیں اِس میں سِمٹتے دیکھے
دِل کا ویرانہ عجب آئینہ خانہ نِکلا

رات کو آنکھوں میں کب تک یوں بِٹھاؤ گے نوید
اب تو سوجاؤ میاں! صبح کا تارہ نِکلا

○○○



رفاقتوں کے زمانے، سراب نکلیں گے
پلک جھپکتے ہی، آنکھوں سے خواب نکلیں گے

ہم اپنے دور کی بے چہرگی پہ کیا روئیں
شکستہ پیڑ کے پھل ہی خراب نکلیں گے

زمین کے بھی کچھ اپنے اُصول ہوتے ہیں
ببول بوئیں تو، کیونکر گُلاب نکلیں گے

چھپا دو گلیوں کو، سڑکوں کے زخم دھو ڈالو
کہ شہر دیکھنے عزّت مآب نکلیں گے

ہمارا قتل نئے بال و پر ہمیں دے گا
ہر ایک قطرۂ خوں سے عُقاب نکلیں گے

اِسی زمین کی مٹّی سے ہم بنے ہیں نوید
اِسی زمین سے روزِ حساب نکلیں گے

○○○



جاگتی راتوں کی ساری تازگی آنکھوں میں ہے
دِن نِکل آیا ہے لیکن چاندنی آنکھوں میں ہے

بند پلکوں کے جھروکوں میں ہیں میرے روز وشب
کھول دے آنکھیں، کہ میری زندگی آنکھوں میں ہے

آئینے سے بچ کے رہنا" تجھ کو جینا ہے اگر
دیکھ اے قاتِل ! مری صُورت تری آنکھوں میں ہے

کالے کاغذ پر لکیریں کھینچتا ہوں بے سبب
کیا کروں ، اِس دَور کی بے چہرگی آنکھوں میں ہے

سادگی میں بھی انوکھا بانکپن رکھتے ہیں ہم
دِل فقیرانہ ہے شانِ خُسروی آنکھوں میں ہے

ورنہ آنکھیں تو فقط اک حلقۂ بے نُور ہیں
سچ تو یہ ہے ، ذہن و دل کی روشنی آنکھوں میں ہے

سبز کھیتوں کا دوپٹّہ اوڑھ کر لیٹی ہوئی
سوندھی مِٹّی سے بنی دوشیزگی آنکھوں میں ہے

جس پہ پڑجائے نظر ، پانی وہ مانگے عمر بھر
کس غضب کی آگ تیری شبنمی آنکھوں میں ہے

وقت کے سیلاب میں ایک ایک منظر بہہ گیا
ہاں مگر، لے دے کے اک تیری گلی آنکھوں میں ہے

میرؔ و غالبؔ کی تو عظمت دل میں ہے میرے نویدؔ
فیضؔ و ناصرؔ کاظمی کی شاعری آنکھوں میں ہے

○○○



یوں سرِ شام در آئی تری خُوشبو مجھ میں
رات بھر بجتے رہے نقرئی گھنگرو مجھ میں

صُورتِ زخم مہکتا جو رہے تُو مجھ میں
آہی جائے گی کسی روز تری خُو مجھ میں

لوگ بیٹھے ہیں لگائے ہوئے آنکھیں کب سے
کوئی کمزور نِکل آئے نہ پہلُو مجھ میں

مَیں نہ ساون ، نہ برستا ہوا بادل ، پھر بھی
جانے کیوں اُڑتے ہیں سہمے ہوئے جُگنو مجھ میں

آسمانوں کے سفر میں مَیں اکیلا تو نہیں
سبز پرچھائیں کی جب تک رہے خوشبُو مجھ میں

مجھ کو باہر کی ہواؤں کا کوئی خوف نہیں
سر اُٹھاتے ہیں کچُھ آسیب گھریلو مجھ میں

میری ہر بات کو تولے ہے شب و روز نوید
وہ جو بیٹھا ہے کوئی لے کے ترازو مجھ میں

○○○



لفظوں میں سانس لیتے ہیں ، مرتے نہیں کبھی
اہلِ سخن، جہاں سے گذرتے نہیں کبھی

احساس اِس قدر ہے اُنہیں اپنے حُسن کا
وہ آئینے کے پاس ٹھہرتے نہیں کبھی

ہم ٹوٹتے ہی کم ہیں ، مگر ٹوٹنے کے بعد
باہر وجود کے تو بکھرتے نہیں کبھی

گہرے سمندروں کی بھلا کیا خبر اُنہیں
آنکھوں کی جھیل میں جو اُترتے نہیں کبھی

یہ سب تمھارے حُسن کے پَرتَو کا فیض ہے
آئینے خود بخود تو سنورتے نہیں کبھی

سہمے ہوئے ہیں اِتنے خود اپنے وجود سے
ہم سامنے سے اپنے گزُرتے نہیں کبھی

نظّارے آسماں کے، زمیں پر نہ ڈھونڈیے
آنگن میں چاند تارے اُترتے نہیں کبھی

گہرے کچھ اور ہوتے ہیں مرہم سے، وقت کے
جو زخم دل کے زخم ہیں، بھرتے نہیں کبھی

جِن کے بدن پہ چہرہ سلامت رہے نوید
وہ آئینے کے ذِکر سے ڈرتے نہیں کبھی

○○○

○

خُود کو حِصارِ ذات کے اندر تو دیکھئے
جالے تنے ہوئے ہیں میاں ، گھر تو دیکھئے

کِھلتے ہیں کیسے کیسے شگُوفے نِگاہ میں
تازہ ہوا کے سامنے جا کر تو دیکھئے

بارش میں بھیگنے کا مزہ آئے گا جناب !
اشکوں کے درمیاں، کبھی ہنس کر تو دیکھئے

ساحل پہ سارے لوگ ، بھنْور میں ہے نا خُدا
کشتی کے ڈوب جانے کا منظر تو دیکھئے

دریا ہیں کِتنے ، کِتنے سمندر چُھپے ہوئے
ریگِ رواں کی تہہ میں اُتر کر تو دیکھئے

ترکِ تعلّقات کا کُھل جائے گا بھرم
اِک بار میری سمت پلٹ کر تو دیکھئے

بونوں کے دست وپا سے اُلجھتے ہو کیوں نویدؔ
آئینہ اپنے قد کے برابر تو دیکھئے

○○○



تیز ، نُکیلی کِرنوں پر ، یوں وار کروں گا
بادل بن کر دُھوپ کا دریا پار کروں گا

باز بہت منڈلاتے ہیں میرے ہاتھوں پر
اب شاخِ زیتوں کو میں تلوار کروں گا

قاتِل کی آنکھوں میں میرے زخم رہیں گے
مَر کر بھی اُس کا جینا دشوار کروں گا

تُم بھی اپنی آنکھوں سے آواز نہ دینا
میں بھی اپنے سائے کو دیوار کروں گا

جِس کی چھت پر ہر دَم روشن آگ رہے گی
بارش میں اِک ایسا گھر تیّار کروں گا

سوتے جاگتے ، آنکھوں میں چُبھتے رہتے ہیں
خوابوں کے سب آئینے مسمار کروں گا

ناصرؔ بانیؔ اور شکیبؔ سے آنکھ مِلا کر
میں خود اپنے لہجے کا اِظہار کروں گا

تیری یاد کے پیکر سے کچھ رنگ چُرا کر
ہجر کی کالی راتوں کو گلنار کروں گا

بن کے نویدؔ اِک روز اُڑوں گا سبز پرندہ
دُور اُفق پر بیٹھا ذکرِ یار کروں گا

○○○



صدیوں کی رات اوڑھ کے بیٹھے ہیں سب یہاں
سُورج نِکل بھی جائے تو پہنچے گا کب یہاں

یارب ! ترے مہاجر وانصار کیا ہوئے
ہر گام پر کھڑے ہیں کئی بولہب یہاں

کانٹوں سے بچ گئے بھی تو کیا خیریت کہ اب
پھُولوں کو چُومنے سے بھی جلتے ہیں لب یہاں

اِس شہرِ بے اماں میں سَلامت نہ تم نہ ہم
شیشے کے بند کمروں میں سب جاں بہ لب یہاں

سج دھج کے شام نِکلی ہے ، اہلِ نظر کی خیر
دیکھیں نقاب اُترتے ہیں کِتنوں کے اب یہاں

آنکھوں میں کس کا عکس لیے پھِر رہے ہو تم
پانی میں چاند ڈوب کے اُبھرا ہے کب یہاں

پتّوں کی طرح ٹوٹ کے بِکھریں گے ایک دن
آنگن کا پیڑ بن کے تو ٹھہرے ہیں سب یہاں

ہم کِس شُمار میں ہیں، ہماری بِساط کیا
مانندِ گرد اُڑتے ہیں نام ونسَب یہاں

ذہنوں میں تیز کانٹوں کے جنگل اُگے نہ تھے
ہم اپنے گاؤں چھوڑ کے آئے تھے جب یہاں

سڑکوں کے پھیلنے میں، کئی گھر سِمٹ گئے
سورج کے رتھ پہ بیٹھ کے اُتری ہے شَب یہاں

پانی پہ لکھ رہے ہیں ہواؤں کی داستاں
حرف وصَدا کے آئینے، دیکھے عجب یہاں

کتبوں پہ نام لِکھنے سے کیا فائدہ نویدؔ
پڑھتا ہے کون خاک نشینوں کو اب یہاں

○○○



نہیں ایسا، کہ کھو جاؤں گا صحرا کی صدا ہو کر
میں سنّاٹے میں بولوں گا، تری آوازِ پا ہو کر

کبھی ایسا ہو، تو مجھ سے نظر پھیرے خفا ہو کر
میں تیرے دل میں اُتروں تیری آنکھوں سے جُدا ہو کر

مرے اعصاب میں اُترے گا، کڑوا ذائقہ ہو کر
مجھے آنکھیں دکھائے گا مرا بچّہ بڑا ہو کر

جزیرہ ہوں مگر میرے لیے یہ بات کیا کم ہے
سمندر میرے پہلو میں کھڑا ہے آئینہ ہو کر

بکھرتے ٹوٹتے لمحوں میں ہم بھی سانس لیتے ہیں
ہمیں جینے کا فن آتا نہیں بے دست و پا ہو کر

مرے سائے میں کل تک بُوئے گُل انگڑائی لیتی تھی
بھٹکتا پھر رہا ہوں آج، جنگل کی ہوا ہو کر

یہ چیخیں، یہ کراہیں، یہ کٹے بازو، یہ جلتے گھر
ہمیں کھا جائیں گے سیلاب، آندھی، زلزلہ ہو کر

نویدؔ اس شخص سے اب دُور ہی رہنے میں لذّت ہے
کہ اس کی قُربتیں ڈسنے لگی ہیں فاصلہ ہو کر

○○○



ہورہے ہیں قتل دِن میں، رات میں
امن کی سُرخی ہے اخبارات میں

میرے آنگن ہی سے اُٹھتا ہے دُھواں
گھر بھیونڈی میں جلیں، میوات میں

قتل کر کے مُجھ کو میرے سامنے
لوگ شامِل ہوگئے بارات میں

صُبح دَم اخبار میں آجاؤ گے
گھر سے مَت نِکلا کرو اب رات میں

پھر بھی دل کی پیاس بُجھتی ہی نہیں
بِھیگتا ہوں روز و شب جذبات میں

آئینہ سورج کو دِکھلانے لگے
روشنی جن کو مِلی خیرات میں

روتے روتے ہم اچانک ہنس پڑے
دُھوپ کیا نِکلی بھری برسات میں

ریت پر جب نام لِکھتا ہوں ترا
پُھول کیوں کِھلتے ہیں میرے ہاتھ میں

رنگ و بُو کا اِک جہاں آباد ہے
ڈُوب کر دیکھو تو احساسات میں

تتلیاں باغوں میں اُڑتی دیکھ کر
کھو گئے ہم ریشمی لمحات میں

اُن کے ذہنوں میں اندھیرا تھا نوید
جو لئے پِھرتے تھے سورج ہاتھ میں

OOO



آبروِ منبر و ناقوس کی رُسوا کیوں ہے
روشنی سڑکوں پہ، ذہنوں میں اندھیرا کیوں ہے

میرا چہرہ تری آنکھوں میں کھٹکتا کیوں ہے
آئینے ! میری طرف دیکھ کے ہنستا کیوں ہے

تجھ کو دیکھوں تو مجھے یاد مری آتی ہے
میرے قاتل ! تُو مرے سامنے آتا کیوں ہے

خُود شناسی کا یہ انداز بدل اے ناداں !
دُھول چہرے پہ ہے، آئینے بدلتا کیوں ہے

گھر کی تاریکی ، سفیدی سے کہاں جاتی ہے
جسم میلا ہے تو پوشاک بدلتا کیوں ہے

شام تک دُھوپ کی تلوار پہ چلنے والا
دِن کی دہلیز پہ، تھک ہار کے بیٹھا کیوں ہے

میری آنکھوں سے نِکل جائے نہ صحرا بھی کہیں
مجُھ کو تصویر سمندر کی دِکھاتا کیوں ہے

میری تنہائی کو آئینہ دِکھانے والے!
گھر کی دیواروں پہ آئینے لگاتا کیوں ہے

کِس نے چنگاریاں بھردی ہیں فضاؤں میں نوید
سانس لیتا ہوں تو سینہ مِرا جلتا کیوں ہے

○○○



شبنم کی بُوند بُوند سے شعلے نکل گئے
اس کی ہتھیلیوں سے مرے ہاتھ جل گئے

کیا دَور آگیا کہ محبّت کے نام پر
سِکّے ہَوس کے کوچۂ جاناں میں چل گئے

مقتل کے پاس تیری گلی یاد آگئی
قاتل کے ہاتھ چومنے ہم سر کے بَل گئے

بچّوں کے ساتھ تجھ کو ترے گھر میں دیکھ کر
جی خوش ہوا، پر آنکھ سے آنسو نِکل گئے

آنگن کے جِھلملاتے سِتاروں کو چھوڑ کر
ہم آسماں کے چاند کو چُھونے مچل گئے

کیا نقش تھے کہ موت کے ہاتھوں نہ مِٹ سکے
کیا عکس تھے کہ آئینہ خانوں میں ڈھل گئے

ق

چُپکے سے آب و گِل کا لِبادہ اُتار کر
خوشبو کی طرح لوگ سفر پر نِکل گئے

صحرا کہیں، سراب کہیں، دشتِ جاں کہیں
افسانے سب کے ایک ہیں، عُنواں بدل گئے

حیرت تو یہ ہے صبح کی کِرنوں کے ہاتھ بھی
اِک شب گزیدہ دن مِری آنکھوں پہ مَل گئے

پھولوں کی پتّیاں مِرے ہونٹوں پہ پھیر کر
آنکھوں سے مِیرؔ کی وہ سُنا کر غزل گئے

جو دیکھنے میں موم کی مانند تھا نویدؔ
اُس شخص کی نِگاہ سے پتّھر پگھل گئے

○○○



جب تک تری آنکھوں کا اِشارہ نہیں مِلتا
کلیوں کو چٹکنے کا بہانہ نہیں مِلتا

جس وقت بھی مِل جائے، ذرا غور سے سُننا
سنّاٹا سدا بولنے والا نہیں ملتا

یہ شہرِ تمنّا ہے، قدم سوچ کے رکھنا
یاں دھڑ سے جُدا ہو کے بھی، چہرہ نہیں مِلتا

میں جس کے لیے چھوڑ کے آیا سبھی رستے
اب اس کی گلی کا مجھے رستہ نہیں مِلتا

آنکھوں میں بسی رہتی تھی جس شخص کی صورت
خوابوں میں بھی اب اُس کا سراپا نہیں مِلتا

ہونٹوں کے قریب آنے کو پانی بھی ترس جائے
ایسا کوئی پیاسا لبِ دریا نہیں مِلتا

○○○



خوشبو کی طرح شہر میں پھیلا نہ کریں گے
ائے جانِ تمنّا ! تجھے رسوا نہ کریں گے

جلتے ہوئے لمحات کا آئینہ دِکھا کر
ہم شہر کو شرمندۂ صحرا نہ کریں گے

ہر شام پگھلتے ہوئے لمحوں کے اُفق پر
خوابوں کے نئے چاند تراشا نہ کریں گے

ہاں رسمِ وفا ہم کو بھی آتا ہے نبھانا
تم پاس سے گزرو بھی تو دیکھا نہ کریں گے

لہروں میں بھی ہیجان رہا دل ہی کی مانند
اب جھیل میں پتّھر کبھی پھینکا نہ کریں گے

تُو ایک چھلاوے کے سِوا کچھ بھی نہیں ہے
سائے کی طرح اب ترا پیچھا نہ کریں گے

○○○



ریشمی لمحوں کی، دل میں تازگی رہ جائے گی
پھول مرجھائینگے، پھولوں کی ہنسی رہ جائے گی

قتل سے پہلے مری آنکھوں میں اے قاتل نہ دیکھ
بے گناہی میری، آنکھوں میں تری رہ جائے گی

بند ہوجائینگے جب حرف وصدا کے راستے
بات کرنے کے لیے اِک خامشی رہ جائے گی

کیا ہمارے شہر کے سب لوگ بہرے ہوگئے
زندگی سڑکوں پہ کب تک چیختی رہ جائے گی

بُجھ کے رہ جائیں گے سارے عِلم ودانِش کے چراغ
غار میں اُتری ہوئی اِک روشنی رہ جائے گی

دُھوپ کے سائے میں طئے کر لو مَسافت عمر کی
چھاؤں رستوں میں کھڑی مُنہ دیکھتی رہ جائے گی

ایک پَل وہ آئینے کے پاس ٹھہرے گا، مگر
آئینے میں دیر تک اُس کی چَھبی رہ جائے گی

چیخ جب زخمی پرندوں کی سُنے گا آسماں
مُدّتوں تک اس کی آنکھوں میں نمی رہ جائے گی

گھر کے بچّے بھی نہ سمجھیں گے زباں اپنی نوید
صِرف کاغذ پر ہماری شاعری رہ جائے گی

○○○



پھیلی ہوئی زمیں تھی کھُلا آسمان تھا
کھیتوں کے آس پاس جب اپنا مکان تھا

دہلیز پر جو سر تھے تو آنگن میں دھڑ کئی
یہ گھر وہی ہے جس میں مِرا خاندان تھا

خوشبوئے جسم و روح کی ترسیل کے لیے
جھونکا ہوا کا اُس کے مِرے درمیان تھا

دانتوں میں مُردہ بھائی کی تھیں بوٹیاں، مگر
اُس کی جبیں پہ سجدوں کا روشن نشان تھا

لہروں کا ہاتھ تھام کے، ساحل تک آگیا
وہ شخص، جس کا ٹُوٹا ہوا بادبان تھا

ماں پھر رہی تھی ہاتھ میں کاسہ لئے ہوئے
گھر تھا، بہوٗ تھی، خیر سے بیٹا جوان تھا

اندر سے ریزہ ریزہ ہوئے تھے نویدؔ ہم
باہر سے جسم اپنا بظاہر چٹان تھا

○○○



کِنارے بیٹھ کے روتے تھے جن کو رونا تھا
ہمارا کام فقط کشتیاں ڈُبونا تھا

وہ شخص گاؤں کا مُکھیا تھا، اور کام اُس کا
گُلاب جیسی زمیں میں بَبُول بونا تھا

یہ وقتِ شام ، یہ پگڈنڈیاں ، یہ تنہائی !
کم از کم ایسے میں سائے کو ساتھ ہونا تھا

یہ اور بات، اُسے کوزہ گر نے چھین لیا
ہمارے گھر میں بھی نایاب اک کِھلونا تھا

سمیٹ لائے ہم آنکھوں میں ساری شادابی
تمھارے گاؤں کا موسم بڑا سَلونا تھا

OOO



سبز کِرنوں کی نظر جس کو خدا دیتا ہے
پتھّروں کو بھی وہ آئینہ بنادیتا ہے

قتل کرتا ہے نہ سُولی پہ چڑھا دیتا ہے
مجھ کو ہر لمحہ وہ جینے کی سزا دیتا ہے

طنز کے تیر نکلتے ہیں لبوں سے اُس کے
وہ جو ہنستا ہے تو محفل کو رُلادیتا ہے

آنکھ میں ڈوب کے گہرائی میں دل کی پہنچو
یہ جزیرہ ہی سمندر کا پتہ دیتا ہے

مَوت کے ساتھ نِکلتا ہوں تو مِلتی ہے حیات
زَہر بھی اَب مجھے اَمرت کا مزہ دیتا ہے

○○○



غم جب آنکھوں کا رکھوالا ہوتا ہے
راتوں میں بھی دِن کا اُجالا ہوتا ہے

تعبیریں خود آنکھ بچاتی پھرتی ہیں
دیوانوں کا خواب نِرالا ہوتا ہے

کمرے میں تنہائی لیٹی رہتی ہے
ہاتھوں میں بس ایک رِسالہ ہوتا ہے

تم چاہے دُنیا کی آنکھیں بند کرو
پھر بھی کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے

میز ، کتابوں اور قلم کے پاس نوید
جانے کیوں ۔ مکڑی کا جالا ہوتا ہے

○○○



آنگن میں تری یاد کی خُوشبو جو اُڑے گی
تنہائی مری پھول کی مانند کھِلے گی

خاکسترِ جاں سے کوئی چنگاری اُڑے گی
مٹّی کا دِیا بُجھتے ہی اِک شمع جلے گی

سناٹے میں کھوجائینگے دنیا کے جھمیلے
خاموشی ہی آواز کا پیمانہ بنے گی

تُم چاہے ہواؤں سے اِسے لاکھ بچاؤ
یہ جِسم کی دیوار تو گر کر ہی رہے گی

ہاتھوں کی لکیروں میں یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو
حالات کی تحریر تو چہروں پہ ملے گی

سُورج نکل آیا ہے چلو، کھوج میں اپنی
سایہ بھی نہ مِل پائے گا جب دُھوپ ڈھلے گی

آرام سے جینے کی ہَوس کِسکو نہیں ہے
دُنیا ہے یہ، آرام سے مَرنے بھی نہ دے گی

میں تیرے لیے جاں سے گزر جاؤں گا جِس دِن
اخبار کی سُرخی تِری آنکھوں میں چُبھے گی

○○○



کیا سبب ہے ، کبھی ہنسنا ، کبھی رونا ہے مجھے
لوگ کہتے ہیں کہ جادُو ہے نہ ٹونا ہے مجھے

روزِ اوّل ہی سے کانٹوں کا بچھونا ہے مجھے
دُھوپ اوڑھے ہوئے لب تک یونہی سونا ہے مجھے

میری آواز کا چہرہ ہے سلامت جب تک
شہر کی بھیڑ میں شامِل نہیں ہونا ہے مجھے

جیسے تیسے بھی ہو ، کٹ جائینگے لمحوں کے پہاڑ
سانس کا بوجھ تو ہر حال میں ڈھونا ہے مجھے

کہیں ایسا نہ ہو ، چہرہ تِرا دھندلا جائے
آئینے ! آج تِرے سامنے ہونا ہے مجھے

نا رسائی کی تھکن ساتھ رہے گی جب تک

آپ کے شہر میں ہونا بھی نہ ہونا ہے مجھے

زخم کی مہکی ہوئی فصل اُگانے کے لیے

اِک تِری یاد کا موسم ہی سلونا ہے مجھے

جو کبھی ٹوٹ کے بِکھرے تھے فِضاؤں میں نوید

اُن ستاروں کو بھی اشکوں میں سمونا ہے مجھے

○○○



شہروں میں سانس لینا بھی دُشوار ہوگیا
ہر شخص تیز دھوپ کی تلوار ہوگیا

پہلے تو صِرف ذہن میں چنگاریاں اُڑیں
منظر پھر اس کے بعد دھواں دھار ہوگیا

میری انا ہی پاؤں کی زَنجیر بَن گئی
میں خود ہی اپنی راہ میں دیوار ہوگیا

منزل شناس آنکھ دُھواں ہوگئی نوید
رہزن ہی آج قافلہ سالار ہوگیا



جس کے دل میں زخم کا کانٹا نہیں
سانس لینا ہی اُسے آتا نہیں

لوگ اخباروں کے عادی ہو گئے
ورنہ چہروں پر بھی کیا لکّھا نہیں

یہ نہیں کہتا، کہ میں اندھوں میں تھا
آنکھ والوں نے مجھے دیکھا نہیں

آگ پلتی ہے مُسلسل ذہن میں
یوں اچانک گھر کوئی جلتا نہیں

قتل ہو کر بھی میں اُس کے ساتھ تھا
میرے قاتل نے مجھے دیکھا نہیں

دِل سُلگتا ہے قلم کی نوک پر
یوں ہی کاغذ کا بدن جلتا نہیں

آنکھ سے اوجھل نہ ہو جب تک زمیں
آسماں کا راستہ مِلتا نہیں

سر پہ چادر دھوپ کی جب تک رہے
جسم سے سایہ جُدا ہوتا نہیں

اُس کا کُوچہ ہو کہ مَقتل ہو میاں
جو گیا اک بار پھر لَوٹا نہیں

گھر سے باہر کیوں نکلتے ہو نویدؔ
دھوپ سہنے کا اگر یارا نہیں

OOO



میں کہاں اور تیرا خواب کہاں
شب کی قِسمت میں آفتاب کہاں

روز مرنا ہے روز جینا ہے
زِیست سے بڑھ کے ہے عذاب کہاں

گُفتگو لاکھ دِلنواز سہی
خامُشی کا مگر جواب کہاں

ڈوبتا جارہا ہے ہر منظر
دیکھ پہنچی ہے سطحِ آب کہاں

اب وفائیں کہاں ہیں سینوں میں
زخم بنتے ہیں اب گلُاب کہاں

آسماں میرے سر پہ ہے ورنہ
غم اُٹھانے کی مجھ میں تاب کہاں

موت لکھتی ہے جس کا دیباچہ
ختم ہوتی ہے وہ کِتاب کہاں

شور کیسا ہے بند کمرے میں
بِھیڑ میں کھو گئے جناب کہاں

ایک دوجے کا آئینہ ہیں نوید
حُسن اور عِشق میں حِجاب کہاں

○○○



(نذرِ سلیمان اریب)

ہر ایک لمحہ فقط ٹُوٹنا بِکھر جانا
یہ زِندگی ہے کہ کوئی شِکستہ پیمانہ

نہ جانے چھوڑ کے جانا ہے کب یہ میخانہ
کہ لمحہ لمحہ چھلکنے لگا ہے پیمانہ

کوئی تو چہرہ نظر آئے جانا پہچانہ
یہ شہر شہر اگر ہے تو کیا ہے ویرانہ

دیارِ دردِ محبّت کو جارہے ہو مگر
خود اپنے سائے سے ہونا پڑے گا بیگانہ

بھنور ہزار سہی راہ میں دل و جاں کی
شکستہ ناؤ میں دریا کو پار کر جانا

صبا[1] بھی چاک بہ داماں ہو جس کی فرقت میں
کہاں ملے گا بتاؤ اب ایسا دیوانہ

ترِی گلی کو کہیں چھوڑ کر نہیں جاتا
ترے دِوانے کو کیسے کہوں میں دیوانہ

نوید سانس کی پتوار کا بھروسہ کیا
بدن کی ناؤ جہاں تک چلے، چلے جانا



[1] ماہ نامہ "صبا"



قتل کرنے کی مجھے جس نے قسم کھائی ہے
کیا بتاؤں میں تمھیں ، وہ تو مرا بھائی ہے

سبز صحرا پہ سمندر کی گھٹا چھائی ہے
اب زمیں حشر کے میداں کے قریب آئی ہے

میرے بچّے! تری ہر بات میں گہرائی ہے
تیری قامت سے زیادہ تری اونچائی ہے

تُو اگر پھیر لے آنکھیں تو میں اندھا ہو جاؤں
تیری آنکھوں کی بدولت مری بینائی ہے

دِل کی دُنیا میں نہ لمحے ہیں نہ دن رات نوید
آنکھ سے اُڑتے پرندوں کی شناسائی ہے

○○○



یہ بھی غلط نہیں کہ میں شعلوں کی زد میں تھا
پانی کا رنگ بھی مِرے خاکی جَسَد میں تھا

روزِ اَزَل زمین پہ تنہا کہاں تھا مَیں
تیرا وجود بھی تو مِرے خال وخَد میں تھا

لوح وقلم ، زَمان ومکاں سب دھواں دھواں
اک سبز چاند چشمۂ نورِ اَبد میں تھا

پتّھر بھی جس کو دیکھ کے آئینہ بن گئے
کیا جانے کیسا حُسن تِرے خال وخَد میں تھا

وہ حَبس ، وہ گھُٹن ، وہ اَندھیرا کہ کچھ نہ پوچھ
تیرے بغیر جیسے میں برسوں لحد میں تھا

○○○



سانس طوفان و تلاطم سے ابھی لڑتی ہے
ناؤ ڈوبی ہے مِری ، نبض کہاں ڈوبی ہے

موجیں مدہوش ہیں ، ساحل کی فضاء بدلی ہے
شام دریا میں نہانے کے لیے اُتری ہے

شاخ زیتون کی نازک تو بہت ہے لیکن
پھول بارود کے پل بھر میں کِھلا سکتی ہے

بند آنکھوں ہی سے دُنیا کا نظارہ کیجے
آنکھیں کھُل جائیں تو بینائی لہو روتی ہے

جھُٹپٹے کا سا سماں ہوتا ہے ذہن و دل میں
میں تو چُپ رہتا ہوں تنہائی غزل کہتی ہے

ہوش مندوں کے ٹھکانوں ہی پہ مِلتی ہے نوید
موت دیوانوں کی قربت سے بہت ڈرتی ہے

○○○



ہمیں ریت کا گھر بنانا کہاں ہے
گھڑی دو گھڑی مُسکرانا کہاں ہے

گلی چھوڑ کر تیری جانا ہے لیکن
گلی چھوڑ کر تیری جانا کہاں ہے

نہ اشکوں کی نہریں نہ زخموں کی فصلیں
خلاء میں مرا آب و دانہ کہاں ہے

میں طُوبیٰ کی شاخوں پہ اُڑتا پرندہ
زمیں پر مرا آشیانہ کہاں ہے

مرے لفظ منبر سے کب بولتے ہیں
مرا لہجہ پیغمبرانہ کہاں ہے

تڑپتا ہو دریا جسے چُومنے کو
نویدؔ اب وہ پیاسا گھرانا کہاں ہے

○○○



جھکولے کھائے ہے سپنوں کی ناؤرات گئے
نہ اتنی تیز چلو اے ہواؤ رات گئے

اکیلے پن کی نہ دیوار ڈھاؤ رات گئے
خود اپنے سائے سے دامن بچاؤ رات گئے

لبوں کی دھوپ بدن میں اگر اُتر جائے
تو گیسوؤں کی گھٹاؤں میں جاؤ رات گئے

ہر ایک لمحہ اندھیروں کے کالے ساحل پر
سحر کے اُجلے گھروندے بناؤ رات گئے

صَدَفْ صَدَفْ میں ہے سُورج کی آب وتاب نوید
سمندروں کی تہوں میں نہ جاؤ رات گئے

ooo



روزِ ازل سے بس یہی چکّر ہے پاؤں میں
ہم گھومتے ہیں مثلِ بگولا ہواؤں میں

صدیوں کی رات رینگ رہی ہے زمین پر
ہم روشنی بکھیر رہے ہیں خلاؤں میں

پگڈنڈیاں اُداس تو پنگھٹ تھے نیم جاں
تیرے بغیر جب بھی گیا تیرے گاؤں میں

سب روح کے جمال سے محروم ہیں یہاں
آنکھیں بھٹک رہی ہیں بدن کی گپھاؤں میں

کیا جانے کس کے نقشِ قدم چوم آئی تھیں
گھنگرو سے بج رہے تھے مسلسل ہواؤں میں

سُورج لپیٹا جائے گا اِک روز اے نوید
اُڑ جائیں گے تمام سمندر ہواؤں میں

○○○



جب سے دل نے اوڑھ لیا ہے زخموں کا پیراہن
آنکھوں کے امبر سے موتی برساتا ہے ساون

بستی بستی کُوچہ کُوچہ فرزانوں کا مدفن
جنگل جنگل صحرا صحرا دیوانوں سے روشن

وقت بھی آدم خور ہے، تازہ تازہ خوں پیتا ہے
اس کے ہاتھوں سے ٹوٹے کتنی سانسوں کے بندھن

آنکھوں سے آنسو برسانا سَب کو آتا ہوگا
کم ہی لوگوں کو آتا ہے آنسو پینے کا فن

تم سے دِل کا رِشتہ جوڑے برسوں بیتے لیکن
پِھر بھی ایسے شرماتی ہو، جیسے تازہ دُلہن

شَبنم کے آنسو پیتے ہی کِھل اُٹھتے ہیں غُنچے
زَخموں کی بَرکھا مانگے ہے تیری یاد کا گُلشن

جَب بھی تنہائی کی ناگن ڈس لیتی ہے مُجھ کو
تیرا لہجہ بن جاتی ہے میرے دِل کی دَھڑکن

جیسے رات کے سنّاٹے میں مَرگَھٹ کی خاموشی
برسوں سے آسیب زدہ ہے میرے مَن کا آنگن

دیکھ نویدؔ اپنوں سے ہرگِز اپنا دُکھ مَت کہنا
اِس سے اور گھنا ہوتا ہے دِل میں زخموں کا بَن

○○○



جب تک تمھاری راہگذر تک نہ آئے گی
سُورج کی روشنی مِرے گھر تک نہ آئے گی

آنکھوں میں روز وشب جو بٹھاؤگے تم اُسے
پاس اِیسے آئے گی کہ نظر تک نہ آئے گی

جب تک امیرِ شہر کے گھر میں دھواں نہ ہو
سڑکوں کی آگ اُس کو نظر تک نہ آئے گی

چھپ کر رہے گی سانس کی مانند اے نویدؔ
زخموں کی آگ دیدۂ تر تک نہ آئے گی





صبا کو صحنِ چمن کا جو راستہ نہ مِلا
تِری گلی سے گذرنے کا اک بہانہ مِلا

زَباں شُگفتہ تو لہجہ پیمبرانہ مِلا
مِزاج ہم کو اَزل سے قَلندرانہ مِلا

خُلوص اُس کا رِیا تھا ، سُلوک اُس کا فریب
اب ایسے شخص کا کیا غم ، مِلا مِلا نہ مِلا

میں شَب گزیدہ ، سحر کی کتاب کیا پڑھتا
ورق ورق پہ وہی رات کا فسانہ مِلا

خزاں رسیدہ شجر تھے بہار میں بھی نوید
کسی بھی شاخ پہ پتّا کوئی ہرا نہ مِلا

OOO



بُجھ گئے خواب آنکھ کھلتے ہی
ہوگئی رات دِن نِکلتے ہی

اِک ندامت کے اشک ڈھلتے ہی
دِل ہوا آئینہ پِگھلتے ہی

زِندگی ! تھک کے بیٹھ گئی
دو قدم میرے ساتھ چلتے ہی

لوگ چہرے بدل بدل کے جئے
ہم رہے آئینے بدلتے ہی

دھوپ کو ڈھونڈتے پھروگے نوید
جِسم کا آفتاب ڈھلتے ہی

○○○



دھڑ کسی کا تو کسی اور کا سر لگتا ہے
آئینہ ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے

جسم کی دھوپ سے جس وقت بھی ڈر لگتا ہے
میرا سایہ مجھے مانندِ شجر لگتا ہے

رائیگاں جائے اب نیند کی وادی کا سفر
ہر شجر خواب کا بے برگ و ثمر لگتا ہے

بند آنکھوں سے جو کرتا ہے نظارہ خود کا
اک وہی شخص مجھے اہلِ نظر لگتا ہے

جانے کس موڑ پہ پہنچی ہے مری بینائی
پھول کا رنگ بھی اب رنگِ شرر لگتا ہے

تیرے دِل میں بھی کوئی زخم سُلگتا ہوگا
تُو بھی ہنستا ہے تو بادیدۂ تَر لگتا ہے

پاؤں رکھتا ہوں تو قدموں کو زمیں ڈستی ہے
سَر اُٹھاتا ہوں تو اَفلاک سے سَر لگتا ہے

گھر کے اَندر بھی سُلگتی ہوئی تنہائی نوید
گھر کے باہر بھی نِکلتے ہوئے ڈَر لگتا ہے

○○○



جس طرف آنکھ اُٹھاؤں ترا چہرہ دیکھوں

یہ نہ ہو پائے تو پھر خود کو میں اندھا دیکھوں

جاگتی آنکھوں سے موسم کوئی ایسا دیکھوں

پھول تو پھول ہیں ، کانٹوں کو بھی ہنستا دیکھوں

خار بن کر مری آنکھوں میں یہ چُبھ جائیں گے

میں ترے سامنے پُھولوں کی طرف کیا دیکھوں

۷۵

آنکھ تو آنکھ ہے ، احساس بھی دھندلانے لگا
زندگی ! اور میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

میری آنکھوں میں شب وروز لپکنے والے
تیری آنکھوں میں کبھی اپنا سراپا دیکھوں

دور کہساروں پہ لہراتا پھروں ہر لمحہ
شام کے ساتھ ہی میں اپنا بسیرا دیکھوں

○○○



بدن سمیٹ کے لائے ہوئے ہو صحرائی
تم اپنا چہرہ کہاں چھوڑ آئے ہو بھائی ؟

بہت عجیب ہے یارو ، ہماری تنہائی
سمندروں کی کہاں ناپتے ہو گہرائی

نفس نفس تری آواز کی لچک ڈولے
نظر نظر ترے انداز کی پذیرائی

فصیلِ شب پہ کھڑے ، تک رہے ہیں دیوانے
نئی سحر کی زمیں پر صبا کی انگڑائی

نوید کاسۂ دل در بہ در لئے نہ پھرو
کہ اس سے ہوتی ہے اہلِ وفا کی رسوائی



روشن تھا یوں حجاب سے اُس کے نئین کا رنگ
شبنم پہ جیسے صبح کی پہلی کِرن کا رنگ

پھولوں میں، جگنوؤں میں، سِتاروں میں، چاند میں
دیکھا کہاں کہاں نہ تِرے بانکپن کا رنگ

بھیگے ہوئے لِباس میں آیا تھا کون شخص
اُترا ہے آئینے میں یہ کِسکے بدن کا رنگ

میں جِس طرف گیا، مِرے قدموں میں آگیا
صحرا کو بھاگیا مِرے دیوانے پن کا رنگ

لب پر ہزار پردے تبسم کے ڈالیے
آنکھوں تک آہی جائے گا دل کی چُبھن کا رنگ

میں گردِ ماہ وسال میں کھو جاؤں بھی تو کیا
دیکھے گا اک زمانہ مِرے فکر و فن کا رنگ

اَندھے بتا رہے ہیں اُجالوں کے خال وخد
اب کیا دکھائی دے گا سحر کے بدَن کا رنگ

پانی میں جیسے قوسِ قزح ڈولتی رہے
یوں ڈولتا ہے من میں ترے پیرہن کا رنگ

پھولوں میں ڈھونڈتے ہیں جو خوشبو کے خال وخد
اُن پر نہ کھُل سکے گا ہمارے سُخن کا رنگ

اُترا بس ایک پَل کوئی پیکر نِگاہ میں
تنہائیوں میں پھیل گیا انجمن کا رنگ

کاغذ پہ کیسے اُترے گی تصویرِ اِضطراب
کب ایک رنگ ہوتا ہے بے چین من کا رنگ

سُورج نہیں، حُسینؓ ہیں سجدے میں وقتِ شام
ہے کربلا کا خون، نہ سمجھو گگن کا رنگ

سرگوشیوں کی لَے میں چٹکتی ہیں ہر گھڑی
کلیوں کی آنکھ میں ہے تمھارے سُخن کا رنگ

غُصّہ تھا، پیار تھا، کہ ادائے ستم نویدؔ!
ہم پر کھُلا نہ اُس کی جبیں کی شِکن کا رنگ

○○○



جانے کیا ہے عمرِ رفتہ کی نشانی آنکھ میں
آئینہ دیکھوں، تو آجاتا ہے پانی آنکھ میں

لمحہ لمحہ ہو رہا ہے سبز کرنوں کا نُزول
یا اُترتے ہیں صحیفے آسمانی، آنکھ میں

کوئی موسم ہو، روانی اِس کی تھمتی ہی نہیں
بھر گیا ہے کتنے دریاؤں کا پانی آنکھ میں

روح کی آنکھوں سے کر نظّارۂ نورِ یقیں
لامکانی حُسن کیا آئے مکانی آنکھ میں

اس کی خاموشی میں کیا کیا حُسنِ گویائی نہ تھا
ہونٹ سے بڑھ کر مِلی جادو بیانی آنکھ میں

جب سے تیرا غم رمری پلکوں پہ لہرانے لگا
کھل رہی ہے دو جہاں کی شادمانی آنکھ میں

ہو رہی ہے ایک مدت سے یونہی شام و سحر
ہجرتوں کے موسموں کی نوحہ خوانی آنکھ میں

جن کو کل تک اپنی پلکوں پر بٹھاتے تھے نوید
چبھ رہے ہیں اب وہی لفظ و معانی آنکھ میں



جو دِن میں بھی اندھیرا دیکھنا ہے
تو آنکھیں کھول کر کیا دیکھنا ہے

نہ تیور ہی نہ لہجہ دیکھنا ہے
غزل میں دل کا چہرہ دیکھنا ہے

نظر کے سامنے جب تم کھڑے ہو
تو پھُولوں کی طرف کیا دیکھنا ہے

تمُھارے ساتھ ہے دُنیا کی رونق
اکیلے کِس کو میلا دیکھنا ہے

کسی کے غم کو آنکھوں میں بسالو
اگر دِن رات اُجالا دیکھنا ہے

لگا ہے اُس کے جو بن سے حسن بدن پر
وہ چہرہ ہے کہ کتبہ دیکھنا ہے

کسی غنچے کے لب پر کان رکھ دو
خموشی کا جو لہجہ دیکھنا ہے

خدایا! ایک لمحہ زندگی دے
مجھے قاتل کا چہرہ دیکھنا ہے

مرے بچے، تری اُنگلی پکڑ کر
مجھے اپنا بڑھاپا دیکھنا ہے

ہمیشہ جھک کے دنیا سے مِلا کر
اگر قد اپنا اونچا دیکھنا ہے

وہ پہلے دشت سے ہو کر تو آئے
مکاں جس کو ہمارا دیکھنا ہے

بس اب تو موت کی آنکھوں میں بس کر
سراپا زندگی کا دیکھنا ہے

شکیبؔ و ناصرؔ و بانیؔ کے جیسا
نویدؔ اب نام اپنا دیکھنا ہے

OOO



کیا بات ہے ، آئے ہنیں پتھّر کئی دن سے
سُنسان سا لگتا ہے مِرا گھر کئی دن سے

اے آسماں ! کیا تیری نگاہیں ہنیں مجھ پر
لگتی ہنیں دہلیز پہ ٹھوکر کئی دن سے

ہر چند کہ بِیتے ہوئے لمحوں نے صدا دی
دیکھا ہنیں ہم نے اُنہیں مُڑ کر کئی دن سے

کیا جانئے کیا ہوگیا بینائی کو میری
آئینہ نظر آتا ہے پتھّر کئی دن سے

ساحِل پہ نویدؔ آپ کھڑے سوچتے کیا ہیں
رہ رہ کے بُلاتا ہے سمَندر کئی دِن سے

○○○



گَردن پہ وار کر کے جو خنجر اُٹھالیا
قاتِل نے روتے روتے مِرا سر اُٹھالیا

کانٹا مِلا کہ پھول کہ پتھّر ، اُٹھالیا
راہوں میں جو مِلا تِری بڑھ کر اُٹھالیا

پانی میں چاند ڈوب رہا تھا کہ دوڑ کر
تیرے بدن کا عکس سمجھ کر اُٹھالیا

کرفیو زرا اٹھا تھا کہ اندھے فقیر نے
کاسہ سمجھ کے ، ٹوٹا ہوا سر اُٹھالیا

بیگانگی کا اُس سے جو پوچھا کبھی سبب
آئینہ میرے سامنے رکھ کر اُٹھالیا

سڑکوں کی سنگباری سے بچ کر جو گھر گیا
دیوار و دَر نے ہاتھ میں خنجر اُٹھالیا

بارِ غمِ حیات ، اُٹھانا ضرور تھا
رو کر اُٹھالیا ، کبھی ہنس کر اُٹھالیا

ٹوٹی ہوئی کمان کی مانند تھا مگر
بیٹے کا بوجھ باپ نے سَر پر اُٹھالیا

صحرا میں روز گار کی خاطر نِکل گیا
سائے کا لطف دھوپ میں چل کر اُٹھالیا

پلکوں سے گِر رہا تھا کہ دامن میں لے لیا
مجھ کو زمیں سے اُس نے فلک پر اُٹھالیا

اب گنبدوں پہ تیرِ چلاتے رہو نویدؔ
پنجوں میں باز نے تو کبوتر اُٹھالیا

○○○



شہر کے نام پہ صحرا نہیں دیکھا جاتا
آدمی بِھیڑ میں تنہا نہیں دیکھا جاتا

بس اِسی خوف سے دیکھے نہیں سپنے ہم نے
ہم سے تعبیر کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا

میری تقدیر مِرے سامنے آجاتی ہے
مجھ سے ٹُوٹا ہوا تارہ نہیں دیکھا جاتا

آ ، تِرے ہونٹوں پہ میں اپنا تبسُّم رکھ دوں
میرے قاتل ! تِرا رونا نہیں دیکھا جاتا

سامنے تم ہو تو میَں کیسے نظر آؤں گا
روشنی میں تو اندھیرا نہیں دیکھا جاتا

میرے زخموں کو سبھی دیکھ رہے ہیں لیکن
تیر کِس سمَت سے آیا ہنیں دیکھا جاتا

دِل کی افسُردگی جب ذہن پہ چھاجاتی ہے
گھر کے بچّوں کا بھی ہنسنا ہنیں دیکھا جاتا

آسماں ڈھانپ دے اب اپنی زمیں پر یا رب !
جسم اب اس کا برہنہ ہنیں دیکھا جاتا

دمِ آخر مرے چہرے سے ہٹالو نظریں
ڈُوبتے وقت کِنارہ ہنیں دیکھا جاتا

پستیاں ذہن کی جب آنکھ میں آجاتی ہیں
قد کسی شخص کا اُونچا ہنیں دیکھا جاتا

چڑھتے سُورج کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے
گِرتی دیوار کا سایہ ہنیں دیکھا جاتا

سَر ہتھیلی پہ لیئے اس کی گلی جاؤ نوید
جیتے جی موت کا چہرہ ہنیں دیکھا جاتا

○○○



دُشوار کِس قدر ہے یہ جاں کا سفر نہ پوچھ
کَشتی کے آس پاس ہیں کتنے بھنْور نہ پوچھ

آندھی کب آئی ٹوٹ گئے کب شجر نہ پوچھ
گُل کیسے ہوگئے ہیں چراغِ نظر نہ پوچھ

آنکھوں میں دیکھنے کی جو طاقت ہو جا کے دیکھ
اک رات میں جلائے گئے کِتنے گھر نہ پوچھ

میرے بدن میں ایک پَرندہ ہے اور بھی
پَرواز کِس کو کہتے ہیں، پَر کاٹ کر نہ پوچھ

احساس دیدہ وَر ہو تو کیا منظروں کی قید
بند آنکھ سے بھی آئے ہے کیا کیا نظر نہ پوچھ

مِٹّی کا ہے قصور کہ برگ و ثمر کا دوش
کیوں ٹوٹنے کو آئی ہے شاخِ شجر نہ پوچھ

گُونگی سماعتیں ہوں تو بابِ سخن نہ کھول
ساحل کی سیپیوں سے مزاجِ گہُر نہ پوچھ

دانشورانِ شہر کے دِل میں اُتر کے دیکھ
اُونچی عمارتوں میں ہیں کیسے کھنڈر نہ پوچھ

خود کو سمیٹتے تو رہے رات بھر مگر
سُورج کے ساتھ بِکھرنے کا ڈر نہ پوچھ

سڑکوں کی بِھیڑ بھاڑ میں مُجھ کو بِکھیر کر
تنہائی میری گھُوم رہی ہے کِدھر نہ پوچھ

کب تک بناتے جائینگے پانی پہ ہم لکیر
کب تک نہ کام آئیگا اپنا ہُنر نہ پوچھ

جب سے ہے دِل میں سَبز اُجالوں کا آسماں
پہنچی ہے کِس مقام پہ میری نظر نہ پوچھ

چمگادڑیں کب آئیں کب آسیب بَس گئے
کِس دن سے ہے درونِ بدَن شور و شَر نہ پوچھ

بارِش میں بھیگتا ہوں شب و روز اے نویدؔ!
کیا جانے کب گِرے گا یہ مِٹّی کا گھر نہ پوچھ

○○○

"غزل"

رہے خیال کہ نازک بہت سخن ہے غزل
سخن کے پردے میں شیشہ گری کا فن ہے غزل

جو پھیل جائے تو ساگر ، سمٹ گئی تو ندی
کسی حسینہ کی جادو بھری نئین ہے غزل

شفق ، دھنک ، گُل و مہتاب ، مئے صبا ، جگنو
ہزار طرح کے رنگوں کا پیرہن ہے غزل

حیا کی اوس میں بھیگی ، حنا میں ڈوبی ہوئی
سُہاگ رات کی شرمیلی اک دلہن ہے غزل

ہو جیسے چاندنی راتوں میں عکسِ تاج محل
وفا کی مرمریں باہنوں کا بانکپن ہے غزل

ہزاروں چاند ستارے ہوں جس کے دامن میں
وہ جگمگاتا ہوا روشنی کا بن ہے غزل

ہر ایک دور میں ہے حسن و عشق کی آواز
زبانِ شیریں کی ، فرہاد کا دہن ہے غزل

شباب و حسن میں اِس کا نہیں کوئی ثانی
ہر ایک دور میں یوسف کا بانکپن ہے غزل

جو پڑھ سکو تو نظر کی زبان سے پڑھ لو
کسی بھی شوخ کے ماتھے کی بے شکن ہے غزل

لچکتی ، جھومتی ، کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی
دکن کی پیاری تلنگن کا بانکپن ہے غزل

بچائے رکھنا زمانے کی بے حسی سے نوید
دیارِ سنگ میں شیشے کا اِک بدن ہے غزل

ooo

مُتفرِق اشعار

اِک سانس جو لیتا ہوں تو مرتا ہوں کئی بار
جینے کے لیے جاں سے گذرتا ہوں کئی بار



پتّھروں کی بستیوں میں آئینے بو کر گیا
کیسا دیوانہ تھا ، کِس انداز سے رو کر گیا



جِس کا سر بارِ رعونت سے کبھی جُھکتا نہ تھا
کل وہ میرے سامنے سے ہاتھ پھیلا کر گیا



گلاب و عِطر کے دامن میں جا کے بستی ہے
نِکل رہی ہے جو خوشبو ترے پسینے سے



نہ مانگو موت کبھی زندگی سے گھبرا کر
چراغ گُل نہ کرو روشنی سے گھبرا کر



سڑکوں پر سر مارے گی ، مر جائے گی
تنہائی جب گھر سے باہر جائے گی



تم تو رُک جاتی ہو دروازے تک آ کر لیکن
دُور تک چھوڑنے آتی ہیں تمھاری آنکھیں



شکیبؔ و ناصرؔ و بانیؔ کی وہ پہچان رکھتے ہیں
نظر کے سامنے جو میرؔ کا دیوان رکھتے ہیں



خاموش جو رہیں تو خود اپنی فُغاں ہیں ہم
دھڑکیں تو کائنات کے دل کی زباں ہیں ہم



جاتو رہے ہو اُس کی گلی کے حدود میں
اُس کی گلی ہے زُلف سی پیچیدہ ، دیکھنا



نظمیں

لوگ اخباروں کے عادی ہو گئے
ورنہ چہروں پر بھی کیا لِکّھا نہیں

چاند کا زخم

(کمسن لختِ جگر "تنویر نوید" کی حادثاتی موت پر)

موت کا پیغام تیرے ساتھ کیسے آگیا
ائے ہلالِ عید ! میرا چاند کیوں گہنا گیا

آشیانے سے نکلتے ہی قیامت آگئی
طائرِ بے بال وپر کو تیز آندھی کھاگئی

ایک پَل میں خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے
کھوگیا ہنستا ہوا بچپن ، کھلونے رہ گئے

کس اندھیرے میں ، متاعِ گوش وچشم ولب گئی
کیسی بینائی . منوں مٹّی کے نیچے دب گئی !

رات کی کھائی سے ہو کر صبح کے تٹ پر گیا
چاند . سورج کے مقابل آتے آتے مر گیا

جگنوؤں کی ٹمٹماتی جوت میں تیرا ظہور
غنچہ غنچہ تیری صورت ، بوٹا بوٹا تیرا نور

زندگی کو خوابِ غفلت سے جگا کر سوگیا
روشنی کا دائمی رستہ دِکھا کر سوگیا

○○○

خُداوندا! میں راضی ہوں!!

——— بیٹے تنویر کی جُدائی پر ———

کِھلونا کیسے ٹُوٹا

کیا بتاؤں

کِھلونا کیسے ٹُوٹا

کیا بتاؤں —!

نہ کانوں تک کوئی آواز آئی

نہ آنکھوں میں لہو کا رِیل پُھوٹا

کِھلونا کیسے ٹوٹا کیا بتاؤں!!

پرندے آشیانوں سے نِکل کر

لچکتی ڈالیوں پر جھُومتے تھے

سحر کے عارض و لب چُومتے تھے

ابھی نکلی نہ تھی بادِ بہاری

کہ ایسے میں ———

اُفق سے۔

صف بہ صف نِکلی فرشتوں کی سواری

مشیّت اوڑھ کر

گھر پر مِرے بارات اُتری

مُنوّر ساعتوں میں رات اُتری!!!

عمارت میں کئی جالے تنے تھے

کئی چمگادڑیں لٹکی ہوئی تھیں

چلو اچھا ہوا ------

اِک زور کی آندھی تو آئی

اچانک کھڑکیاں سب کھُل گئی ہیں

مِرا کیا --

میں ازل ہی سے

نئے زخموں کا عادی ہوں

خداوندا!!

میں راضی ہوں!!!!

OOO

دُوردَرشَن

آئینوں میں حسیں خواب کھلنے لگے

روشنی ذہن کی

آنکھ میں آگئی

آسماں اور زمیں

آنگنوں میں گلے آج مِلنے لگے

ریشمی، نیلگوں، سبز پرچھائیاں

جُھومتی، گُنگُناتی ہوئی ندّیاں

نِت نئی ساز وآواز کی تتلیاں

مسجدوں، مندروں، گرُدواروں، کلیساؤں کی روشنی

کِھڑکیوں، روزنوں اور دریچوں سے

چھَن چھَن کے آنے لگی

فاصلے مِٹ گئے ۔۔۔

سیمیں زینوں پہ ٹھہری ہوئی

اے حسیں نغمگی!

تیری آغوش میں

گھر مِرا مِثلِ صحرا نہیں

میں اکیلا بھی رہ کر

اکیلا نہیں!

○○○

یہ درد ہی دوا بنے



گردن سے پیٹھ --

پیٹھ سے پیروں تک آگیا

یہ کیسا درد سارے بدن میں سماگیا

تیزاب بہہ رہا ہے رگوں میں کہ خون ہے

راتوں کو نیند ہے نہ ہی دن کو سکون ہے

بچھو کہاں سے آگئے گردن میں پیٹھ میں

جھنکار ہے یہ کیسی رگ وپٹے میں رات دن

پھنکار سی ہے ریڑھ کی ہڈی میں ہر گھڑی

جیسے نخاعی ڈور نہیں سانپ ہے کوئی

اعصاب ہیں کہ تار ہیں بجلی کے اے خدا !

کیسی دہکتی آگ میں بھننے لگا ہوں میں !

کس جرم کی سزا ہے جو سہنے لگا ہوں میں ؟

سہہ لوں گا میں یہ درد یہیں پر کسی طرح

مجھ کو بچائے رکھنا حساب وکتاب سے

یارب عذابِ حشر سے مجھ کو نجات دے !

○○○

بولتا چراغ بجھ گیا!

(نذرِ فیض احمد فیض)

مُہیب رات کھا گئی چراغ کو!

بِس بھری مُہیب رات کھا گئی چراغ کو

سمندروں کے جذر و مد میں ڈولتا ہوا چراغ

صَدَف صَدَف گُہر گُہر ٹٹولتا ہوا چراغ

ہوا کی تیز قینچیوں کی زد میں بولتا چراغ

ناگ جیسے موسموں کا زہر پی کے

اُجلی، نیلی، سبز روشنی کو رولتا چراغ!!

زمیں کی بوڑھی پیٹھ پر

لدا ہوا یُگوں کا بوجھ

اپنے سر پہ لاد کر

نئے سفر کے اُجلے بادبان کھولتا چراغ

دہانِ زخم سے ---

دِلوں کی بات بولتا چراغ

ہزاروں آنکھیں --

جِس کی لَو میں تھرتھراتی کانپتی

ہزاروں سانسیں --

جس کی ایک سانس میں گھُلی مِلی

خود اُس کی اپنی ذات میں

چھپی ہوئی ---

مُہیب رات کھا گئی چراغ کو

بس بھری مُہیب رات

کھا گئی چراغ کو

مُہیب رات!!!

○○○

آگہی

ہواؤں میں تری خوشبو رواں ہے

تجھے دیکھوں ـ ـ ـ ـ

وہ بینائی کہاں ہے؟

ooo

عشرتِ قطرہ

اگر ہر طرف

تُو ہی تُو ہے ....

تو پھر

مَیں کہاں ہوں؟

○○○

تعاقُب

درختوں کے پیچھے

پگھلتے ہوئے چاند کی

زرد کرنیں۔۔

مرے ذہن میں تیز نشتر کی مانند

پیوست ہوتی چلی ہیں

وہ یادیں

کہ جن کو میں دفنا چکا

صف بہ صف آ کھڑی ہیں

درختوں کے پیچھے!

○○○

سوال

رات کے وقت کون بچھڑا تھا

ذہن پر زور دے کے یاد کرو

میری چاہت کے اُجلے دامن پر

یوں نہ اپنی ہوس کے رنگ بھرو

جسم کی لذّتوں کے دلدل میں

جو گِرا

پھر کبھی ہنیں اُبھرا

چاند میں،

چاندنی میں

پھولوں میں،

تُم ہی تُم ہو

تو پھر جُدائی کیا

شکوۂ زخمِ بے وفائی کیا

شوقِ وارفتگی کے عالم میں

جانے کیا تم نے خط میں لِکھ ڈالا!

○○○

نیند

اُونگتے کوچہ و بازار کی آنکھیں جھپکیں

شہر کے دل کی خموشی کا فسوں ٹوٹ گیا

دُور کہساروں پہ چاندی کی پھواریں پھوٹیں

مسجد و مندر و گرجا کے نگہباں جاگے

دُور پنگھٹ پہ کئی تازہ کنوَل لہرائے

لیکن اب تک ——

اُسی پگڈنڈی کی

آنکھیں نہ کھُلیں ---!

ooo

ردِّ عمل

شب کے پچھلے پہر
دِل کی دہلیز پر
میں نے مانوس قدموں کی آہٹ سُنی

ذہن سے میں نے پوچھا
کہ تُو نے ابھی
کوئی آہٹ سُنی ؟
ذہن گویا ہوا

"کوئی آہٹ ہنیں"

میں نے پھر۔۔۔۔

آنکھ کے پاس جا کر کہا

"تیری پلکوں کی چِلمن اُٹھا کر ابھی

کون آیا بتا"

آنکھ پر

ایک سکتہ سا طاری ہوا

آنکھ پتھرا گئی!

○○○

"سعیِ رائیگاں"

ہم بھی کِتنے ناسمجھ ہیں

ہر نئے سُورج

کے آئینے میں

اپنے

خواب ڈھونڈے جارہے ہیں!

OOO

اِنتباہ

عذاب آسماں سے

اُترتا نہیں

بستیاں جوں کی توں ہیں

تو یہ مت سمجھنا

کہ اب آسماں پر۔۔

خُدا ہی نہیں ہے

ooo

دکن کے کُہسار

قطب[1] کے عہدِ وفا کے امٹ دیار!

تیرے مہکتے تن کا حِصار باندھے

نہ جانے کب سے ---

یہ صف بہ صف بے شُمار بہت کھڑے ہوئے ہیں

ہزاروں راتیں، بدن میں ان کے اُتر چکی ہیں

ہزاروں صبحوں کی سُرخ کرنیں

رگوں میں اِن کی بکھر چکی ہیں

ہزاروں سورج ہیں جذب اِن میں

ہزاروں سیلاب --

سَر سے اِن کے گذر چکے ہیں

---

[1] یہاں میں نے خود قطب شاہ اور عام طور سے دکن کے رواج کے مطابق بر وزنِ کتب باندھا ہے۔

مگر یہ پھر بھی

جہاں کھڑے تھے

وہیں کھڑے ہیں ----

سیاہ تن پر۔ کہیں تو

زخموں کی چادریں ہیں

سفید لمحوں کی ---- چاندنی بھی بچھی ہوئی ہے

یہ سارے پربت ----

خموش رہ کر بھی بولتے ہیں

بغیر آنکھوں کے دیکھتے ہیں

یہ سوچتے ہیں ---

کبھی کبھی تو یہ قہقہے بھی لگا چکے ہیں

لہو کے آنسو بہا چکے ہیں

کشادہ دامن میں لہلہاتی

مچلتی بَل کھاتی مست ندیاں

رسیلے جھرنوں کے زمزمے ہیں

یہ سارے پربت!

قُطب کی عظمت کے پاسباں ہیں

زمیں پہ رہ کر بھی آسماں ہیں!

OOC

وہ چہرہ

(نذرِ عزیزہ تلسی)

وہ اک جھرنا
جو چٹانوں کا سینہ
چیر کر
نغمے سُناتا تھا

وہ اک شعلہ
جو سانسوں کے
گھنے جنگل میں
خوابوں کی
نئی شمعیں جلاتا تھا

وہ چہرہ
جس کی آنکھوں میں
سُلگتے موسموں کا
سُرخ ہالہ تھا

پہاڑوں کی بلندی پر
ہواؤں سے جو لڑتا تھا
انا کے تیز کانٹوں پر
جو ننگے پاؤں چلتا تھا
وہ کاغذ پر ----
ادھورے خواب چھوڑے
دیکھتے ہی دیکھتے
نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے
مگر -----
اب بھی
چٹانوں
تیز طوفانوں سے لڑتے بادبانوں
فکر و فن کے آسمانوں میں
وہ چہرہ مسکراتا ہے
وہ چہرہ!

OOO

کیوں؟

نُور پروردہ زمیں پر، رات کا پہرہ ہے کیوں
آسماں، دیوار بن کر راہ میں ٹھہرا ہے کیوں

خوشبوؤں کے شہر میں بارود کیسے آگئی
یہ اچانک بیٹھے بیٹھے میرا دم گھُٹتا ہے کیوں

منبر و ناقوس کی بینائی آخر کیا ہوئی ؟
قُربتوں کے نام پر اب فاصلہ ڈستا ہے کیوں ؟

شہر کے دیوار و در پر خامُشی کیوں جم گئی
ہر گلی کوُچے میں میرے گھر کا سنّاٹا ہے کیوں

ہم نئے موسم کے خالق ہیں تو پھر ہم میں نوید
ٹُوٹتے رنگوں کا لاوا روز و شب بہتا ہے کیوں

ooo

وہ البیلا سخنور

(نذرِ تاج مہجور)

وہ اک سیّال منظر تھا

جو آنکھوں کے دو آبے سے گذر کر

دِلوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا

وہ اک شاداب جنگل تھا

گھنا شاداب جنگل ــــ

جسے ہر پَل سُلگتے موسموں کی

دھوپ پی کر

مسکرانے کا جنوں تھا

تھی سر پر جس کے بھاری رات

لیکن ---

نگاہوں میں اُجالوں کا فُسوں تھا

وہ البیلا

سجیلا ---

آبنوسی رنگ کا بانکا سخنور

اندھیری رات کے کالے ورق پر

اُجالا لکھ رہا تھا

سُلگتے لمس کے صحرا میں کب سے

لہو کے بیل بوٹے بو رہا تھا

اچانک --

ایک پل میں

نگاہوں سے جو اوجھل ہو گیا ہے

وہ خوابوں کے

تعاقب میں

اُفق کی اُجلی نیلی وادیوں میں کھو گیا ہے

پرندہ -- سبز بن کر

نُور کی شاخوں پہ ہر پل جھومتا ہے

وہ البیلا سخنور!!

ooo

ہم خطاوار ہیں اے خدا
(اکتوبر ۱۹۹۲ء مہاراشٹرا میں زلزلوں کی تباہی کے دوران)

کتنی مدّت سے ہم

روشنی سے پرے

اوڑھ کر گھُپ اندھیرا تھے سوئے ہوئے

ایک جھٹکا زمیں کو لگا

آنکھ کھُلنے لگی --

اشک پلکوں پہ ہیں

تھرتھراتے ہیں لب

آج تیری طرف

ہاتھ اُٹھاتے ہیں سب

مالکِ المُلک

مُختارِ ارض و سما!

تیرے ہاتھوں میں ہیں

آسمان و زمیں

تیری آنکھوں میں ہیں

سب مکاں سب مکیں

ہم خطاوار ہیں

ہم گنہگار ہیں

ہم سزاوار ہیں

ہم درندوں سے بڑھ کر بھی خونخوار ہیں !!

ہاں مگر رات دِن

نام لیکر ترا ۔۔۔

سانس لیتے ہوئے

ان چرندوں، پرندوں کی خاطر سہی

چیختی بھاگتی ماؤں کی گود میں

سانس روکے ہوئے

ننھے معصوم بچّوں کی خاطر سہی

اب غضب روک دے ۔ ۔

تُو تو غفّار ہے

تُو تو ستّار ہے

تو سزا کا جزا کا بھی مُختار ہے

تیری رحمت بڑی ہے غضب سے ترِے

رحم کر

رحم کر

اَرحَمُ الرّاحِمین

اَرحَمُ الرّاحِمین !!!

٥٥٥